R. N. 7900/57 — Regd. No.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

Telephone No.23

Telegram: "ANJUMAN"

# ہماری زبان

جلد ۲۱ - شمارہ ۲۸ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء

ابو محمد سحر

## امیر مینائی کی شرح ہدایت السلطان

امیر مینائی کی تصانیف کی فہرست میں دو فارسی کتابوں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" کے نام عموماً نظر آتے ہیں لیکن کچھ عجیب اتفاق ہے کہ مطبوعہ ہونے کے باوجود ان کتابوں کا ذکر کرنے والوں میں سے کسی کو یہ دیکھنے کو نہیں ملیں۔ چنانچہ عام طور پر یہ کتابیں ناپید سمجھی جاتی ہیں۔ اکثر حضرات نے ان کتابوں کے متعلق یا تو سنی سنائی باتیں لکھی ہیں یا پھر قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ مولوی عبدالحق اپنے ایک مضمون میں جو انھوں نے امیر مینائی کی وفات پر لکھا تھا رقمطراز ہیں :-

"منشی صاحب سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے۔ اس باریابی کی وجہ غالباً ان کی دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان ہوئیں۔ یہ کتابیں آج کل کہیں نہیں ملتیں اور نہ یہ پتا ہے کہ ان میں کیا لکھا گیا ہے۔ غالباً یہ بادشاہ کی کتابوں کی شرحیں ہیں۔ واجد علی شاہ کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور ادھر ادھر سے چند کتابیں اٹھائیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کرلئے وہ اس بات کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا میں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کردئے ہیں۔ غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز ان کے درباری ان کتابوں کو اعلیٰ تصانیف میں سے خیال کرتے تھے ایسی ان مل اور بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنا منشی صاحب مرحوم ہی کا کام تھا"[۱]

واجد علی شاہ کے دربار میں امیر کی رسائی کا ذکر کرتے ہوئے امیر احمد علوی لکھتے ہیں :-

"اس محبت بیزد عشق دوست سرکار تک منشی امیر احمد کی رسائی ۱۲۶۹ھ میں ہوئی۔ دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان تصنیف کرکے حضور اقدس میں گذرانیں اور خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔ ان کتابوں میں کیا مضمون تھا؟ اس کا بتلانے والا کوئی نہیں سلطنت کے ساتھ کتب خانۂ شاہی بھی بھولا ہوا خواب ہوگیا۔ نہ شاعر ہے نہ شاہ، کتابوں کا نام صفحۂ قرطاس پر باقی ہے"[۲]

ممتاز علی آہ نے لکھا ہے :-

"بادشاہ (واجد علی شاہ) کے دو مختصر متن تھے جو کسی خاص فن میں نہ تھے اور صحت وغیرہ میں بھی پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے تھے۔ حضرت نے اپنی علمی قابلیت اور زور طبیعت سے ان میں معنی پہنائے اور کھینچ تان کر فنون کے قالب میں لائے۔ غلط کو صحیح بنایا اور صرف یہی نہیں بلکہ ان میں صنائع بدائع پیدا کئے اور ایک کا نام ہدایت السلطان دوسری کا نام ارشاد السلطان رکھا"[۳]

انھیں کتابوں کے متعلق جلیل مانک پوری لکھتے ہیں :-

"۱۲۶۹ھ میں حسب الحکم شاہ اودھ دو کتابیں امیر نے تصنیف کیں جن کا نام ہدایت السلطان اور ارشاد السلطان ہے"[۴]

---

۱؎ چند ہم عصر ص ۲۔ ۲؎ تذکرۂ امیر ص ۱۶۔ ۳؎ امیر مینائی ص ۹۴۔
۴؎ سوانح امیر مینائی ص ۲۲۔

ان اقتباسات کا موضوع اگرچہ ایک ہی ہے لیکن ان میں کچھ اتنی مختلف باتیں جمع ہو گئی ہیں کہ جب تک پڑھنے والے کو حقیقت کا علم نہ ہو وہ کسی معقول نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ ممتاز علی آہ نے بالیقین اور مولوی عبدالحق نے قیاساً ان کتابوں کو واجد علی شاہ کی تحریروں کی شرح قرار دیا ہے۔ امیر احمد علوی اور جلیل مانکپوری کے بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ خاص امیر کی تصنیفیں ہیں۔ مولوی عبدالحق نے قیاساً اور امیر احمد علوی نے یقینی طور پر ان کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ دربار واجد علی شاہ میں امیر کی رسائی سے ملایا ہے۔ ممتاز علی آہ اور جلیل کے مطابق یہ کتابیں کسی قدر بعد کی ہیں۔ بظاہر اس پر سب متفق ہیں کہ یہ کتابیں غدر سے پہلے کی ہیں۔ جلیل کے "حسب الحکم شاہ اودھ" لکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا منشا بھی یہی ہے لیکن انھوں نے ان کا سال تصنیف ۱۲۷۳ھ درج کیا ہے جو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد کا زمانہ ہے۔

کچھ عرصہ ہوا مجھے اُستاذی جناب مسیح الزماں صاحب سے معلوم ہوا کہ ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب ادیب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں، چنانچہ حال میں جب میں امیر مینائی کی نایاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کی جستجو میں بھوپال سے باہر نکلا تو لکھنؤ میں حضرت ادیب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ موصوف کے کتب خانہ میں ہدایت السلطان کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود تھا جسے ازراہ عنایت انھوں نے مجھے دیکھنے کے لئے مرحمت فرمایا۔ ارشاد السلطان کا اگرچہ پتہ نہ چل سکا لیکن چونکہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی قسم کی بتائی جاتی ہیں اس لئے ہدایت السلطان کے ملنے سے اس کی نوعیت بھی بڑی حد تک سامنے آگئی۔

امیر مینائی کی اس تالیف کا مذکورہ نسخہ درمیانی ناپ کے ۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں سرورق نہیں ہے جس کی وجہ سے پہلی نظر میں کتاب اور اس کے مصنف کا نام وغیرہ معلوم نہیں ہوتا۔ پہلا صفحہ سادہ ہے۔ متن کا آغاز دوسرے صفحہ سے ایک معمولی لوح کے تحت ہوا ہے۔ پانچویں صفحہ پر سبب تالیف کے بیان میں مصنف کا نام "امیر احمد متخلص بہ امیر" آیا ہے۔ آخری صفحہ پر "تمام شد" کے نیچے خاتمۃ الطبع کی عبارت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا اصل نام "شرح ہدایت السلطان" اور تاریخی نام "رموز تدقیقات" ہے جس سے ۱۲۶۸ ہجری نکلتے ہیں اور اس کے نیچے مندرج بھی ہیں۔ درمیان میں ایک عربی قطعۂ تاریخ ہے۔ اس کے چوتھے مصرعے کے نیچے بھی ۱۲۶۸ھ درج ہے۔ اس کے بعد کے جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب سلطان واجد علی شاہ کے حکم، کپتان مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبول کے اہتمام، امیر علی خاں ہلال کی تصحیح اور محمد خورشید کے خط سے اختتام کو پہنچی۔ مطبع کا نام کہیں درج نہیں لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی طباعت شاہی مطبع ہی میں ہوئی۔

امیر نے ابتدا کے کئی صفحات میں بطور تمہید و مقدمہ حمد، نعت، شرح کے سبب تالیف اور بادشاہ کی اصل کتاب کی شان نزول وغیرہ کے بیان میں بڑی عبارت آرائی کی ہے جس سے خاص باتیں یہ منکشف ہوتی ہیں کہ واجد علی شاہ کی اصل عبارت عربی زبان میں ہے اس کا موضوع "نکات عجیبہ، تدقیقات و نصائح غریبہ" ہے اور امیر نے اس کی فارسی شرح بادشاہ ہی کے حکم پر لکھی۔ اس کے بعد "ہدایت اقدس" کے عنوان سے امیر نے واجد علی شاہ کا ایک ایک عربی جملہ درج کر کے لفظی و معنوی اعتبار سے اس کی تشریح کی ہے اور اپنی علمیت، زبان دانی، جزرسی اور دلیل آفرینی سے بادشاہ کے اقوال کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ شرح کے ختم ہونے پر امیر نے خاتمہ کے عنوان سے مزید عبارت آرائی کی ہے جسے اس کتاب کا آخری جزو سمجھنا چاہئے۔ جس زمانے کی یہ نثر ہے اس میں ذرا سی بات کے لئے بہت سے الفاظ استعمال کرنے کا یوں بھی رواج تھا لیکن شرح ہدایت السلطان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شارح نے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرنے کیلئے اور بھی طول کلام سے کام لیا ہے۔ واجد علی شاہ کے عربی جملے اگر ایک ساتھ لکھے جائیں تو دو یا تین صفحات سے زیادہ نہ پھیلیں گے۔ لیکن امیر نے تمہید، سبب تالیف، مقدمہ، شرح اور خاتمہ میں زور قلم دکھا کر کتاب کو ۵۹ صفحات تک پہنچا دیا ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے واجد علی شاہ کے طریق تصنیف و تالیف کے باب میں جو کچھ لکھا ہے معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے کیونکہ واجد علی شاہ کی جو کتابیں دستیاب ہوتی ہیں ان سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ہدایت السلطان کے عربی جملے بھی بادشاہ کے غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ بالفرض یہ ماخوذ ہوں بھی تو انھیں کسی طرح مختلف مضامین یا علوم کی کتابوں کی نقل نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مختصر یہ کہ شرح ہدایت السلطان حکمت و اخلاق پر مشتمل واجد علی شاہ کے ایک مختصر عربی متن کی شرح ہے جسے امیر مینائی نے انھیں کے حکم سے ۱۲۶۸ھ میں لکھا تھا اور جو اسی سال یا اگلے سال زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

شرح ہدایت السلطان کے دستیاب ہونے سے اس کتاب کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں اور قیاس آرائیوں کا ازالہ تو ہو ہی جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے امیر کے سوانح کے ایک اہم پہلو پر بھی نئی روشنی پڑتی ہے۔ واجد علی شاہ کے دربار میں پہلی بار امیر کی باریابی کا سال اکثر حضرات نے ۱۲۶۹ ہجری لکھا ہے۔ لیکن اگر شرح ہدایت السلطان واجد علی شاہ کے حکم پر ۱۲۶۸ ہجری میں لکھی جا چکی تھی اور اس سے پہلے جیسا کہ ممتاز علی آہ نے لکھا ہے امیر شہزادہ ندرۃ السلطان کی اتالیقی کے سلسلے میں دربار میں باریاب ہو کر قصیدہ اور مثنوی کبوتر نامہ وغیرہ پیش کر چکے تھے تو یہ ماننے میں تامل کی گنجائش نہیں کہ یہ واقعہ ۱۲۶۹ھ سے پہلے کا ہے۔ واجد علی شاہ کے دربار میں امیر کی رسائی اگر اور پہلے نہیں تو کم از کم ۱۲۶۸ ہجری میں ضرور ہو چکی تھی۔

# ہماری زبان

۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء

## اِسے کیا کہیئے

ہندی کے جو حامی ریڈیو کی اس پالیسی کے خلاف کہ خبروں کی زبان اور عام فہم ہو، احتجاج کر رہے ہیں، وہ جذبات کی رو میں عقل کی بات کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ وہ لوگ اُسی زبان کو خوب سمجھتے ہیں جو برسوں سے رائج رہی ہے، سرکاری گزٹ کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی اپنی تصانیف میں جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ بول چال کی زبان سے خاصا بُعد رکھتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے کوئی منصف مزاج آدمی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خبریں سب کے لئے ہوتی ہیں، اس لئے خبروں کی زبان کو عام فہم اور سہل بنانا ایک اچھی بات ہے، یہ کسی زبان کے خلاف نہیں ہے، بلکہ دراصل اس زبان کی خدمت ہے۔ اب اگر مشکل الفاظ کی جگہ آسان الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو یہ لفظ انگریزی کے ہوں یا اُردو کے، ان کے خلاف مُہم چلانے کے کیا معنی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اخباروں سے روز ایسی تقریروں اور بیانات کا علم ہوتا ہے جن میں اس پالیسی پر نکتہ چینی کی جاتی ہے، اور اسے ہندی کی خدمت سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہندی کے ودوانوں اور عالموں کی خدمت ہو تو ہو، ہندی کی خدمت نہیں ہے۔ ہندی کی خدمت یہی ہے کہ وہ عام فہم اور مقبول ہو اور سب زبانوں کے الفاظ اس میں کھپ سکیں اور کھپائے جا سکیں۔

اسی طرح گجرات میں یہ کوشش ہو رہی ہے کہ وہاں کسی کالج کو یہ اختیار نہ ہو کہ انگریزی میں تعلیم دے سکے۔ یہ مسئلہ اب سپریم کورٹ کے سامنے ہے اور اس کے فیصلے کے بعد یہ معلوم ہو جائیگا کہ قانون اور دستور کی رو سے اس قسم کی پابندی لگائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ مگر تعلیمی نقطۂ نظر سے تو یہی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی کالج انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم دینا چاہتا ہے تو یونیورسٹی اس کی اجازت دے دے۔ اگر ریاستوں کی سرکاری زبانوں کو ہی ذریعہ تعلیم مان لیا گیا اور دوسری زبانوں کو ٹاٹ باہر کر دیا گیا تو ایک ریاست کے بیشتر اشخاص دوسری کے کام کرنے والوں سے ذہنی رابطہ کیسے قائم کریں گے، تعلیم کے معیاروں کا کیا ہوگا، قومی یک جہتی کا خواب کیسے پورا ہوگا۔

وزیر داخلہ حکومت ہند نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگلے اجلاس میں لوک سبھا اور راج سبھا میں ایک بل پیش ہوگا جس کی رو سے ہندی کے ساتھ انگریزی کو ایک شریک زبان (Associate language) کی حیثیت سے باقی رکھا جائے گا۔ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور ہو سکتا ہے۔ اس سے اختلاف کی بھی گنجائش ہے اور اس کی تائید میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر ڈاکٹر رگھو ویرا نے ۱۱ اور ۱۲ اگست کو اس بل کی مخالفت کرنے کے لئے جو اجتماع طلب کیا ہے، وہ ہم سب کی توجہ چاہتا ہے۔ ڈاکٹر رگھو ویرا نے کہا ہے کہ آزادی کے پندرہ سال بعد بھی ہماری زبانوں کو وہ حیثیت نہیں ملی جس کی وہ مستحق ہیں، ریاستی قانون بنانے والی سبھائیں ریاست کی زبان میں قانون پاس نہیں کرتیں، مادری زبان کی کتابوں کی مانگ کم ہے، ریاستوں میں اور مرکز میں انگریزی کی مطلق العنان حکومت ہے۔ انگریزی کو شریک زبان مان لینے سے ہندوستان کی زبانوں کا درجہ گھٹے گا۔ انگریزی کا سیلاب ہماری زبانوں اور اُن کے ادب کا بیڑہ غرق کر دے گا۔ ہماری تہذیب کیسے باقی رہے گی۔ ہندوستان کی شخصیت (خصوصیت) فنا ہو جائے گی۔ ڈاکٹر رگھو ویرا چاہتے ہیں کہ ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے نمائندے مل کر اس بل کی مخالفت کریں اور اسے پاس نہ ہونے دیں۔

ڈاکٹر رگھو ویرا نے اپنے بیان میں جو باتیں کہی ہیں اُن میں سے بیشتر محل نظر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستانی زبانوں کی بھی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی، مگر اس ترقی کی طرف قدم تو تیزی سے بڑھا ہے۔ کئی ریاستی سبھائیں اپنے قانون ریاستی زبان میں پاس کرتی ہیں۔ علاقائی زبانوں کی کتابیں پہلے سے بہت بڑی تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔ ہر ریاست میں عام کام انگریزی کے بغیر چل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انگریزی ہمیشہ کے لئے اس مقام پر فائز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اب تک تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کی جگہ کسی ہندوستانی زبان کو لینا ہے۔ یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں مختلف وجوہ سے ہندی کو انگریزی کی جگہ لینا ہے۔ مگر اس کے لئے جلد بازی کرنا، مختلف علاقوں کی مصلحت کو نظر انداز کرنا، جنوبی ہند کے زبردست احتجاج کو محض ہٹ دھرمی سمجھنا، کسی طرح دانشمندی نہیں۔ ہمیں اس کے لئے پوری تیاری کرنا چاہیئے اور درمیانی وقفے کے لئے خاصی مدت رکھنا چاہیئے۔ ایسے معاملات میں ایک گروہ کو اکثریت کے بل پر فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے، سب کی رضامندی سے چلنا چاہیئے۔ مخالف پیدا کر کے آگے بڑھنے میں خطرہ رہتا ہے۔ سب کو ساتھ لے کر چلنے میں دیر لگتی ہے مگر پھر منزل پر پہنچنے کا مسئلہ مشکوک نہیں رہتا۔

ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر رگھو ویرا کی نیت نیک ہے، مگر اُنھیں اتنا تنگ نظر نہیں ہونا چاہئے کہ انگریزی کے ابھی کچھ دن اور استعمال سے ہندوستان کی تہذیب کے لئے خطرہ محسوس کرنے لگیں۔

ہندوستان کی تہذیب، فصل کی تہذیب نہیں وصل کی تہذیب ہے۔ وہ ہر اچھی چیز کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ [illegible] عناصر کو خارج نہیں کرتی۔

# انجمن ترقی اُردو راجستھان کے خازن کا انتقال

۱۰ جولائی کو انجمن ترقی اُردو راجستھان کے خازن پنڈت کاشی پرشاد تواڑی ریٹائرڈ ڈی۔ آئی۔ جی۔ پولس راجستھان کا انتقال حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ہو گیا۔ موصوف ۱۹۵۷ء سے انجمن ہٰذا کے خازن تھے اور اُردو کے نمایاں مخلص و بہی خواہ تھے۔ جفاکشی، صاف گوئی، بے لوثی اور قومی و ملکی خدمات میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ خوش اخلاقی، دوست نوازی، تواضع اور دیگر خوبیوں میں بھی قدیم مشرقی روایات کا نمونہ تھے۔

انجمن ہٰذا میں ان کی جگہ مشکل سے پُر ہو گی۔

انجمن ہٰذا اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پسماندگان کے شریکِ غم ہونے کا یقین دلاتی ہے اور خدمات انجمن کی معترف ہے۔ (احترام الدین احمد شاغل)

## بزمِ جیون حیدرآباد

۳۰ جون ۶۲ء کو بزمِ جیون کا ماہانہ ادبی جلسہ و مشاعرہ "جیون محل" چار کمان میں منعقد ہوا۔ تمکین سرمست صاحب نے جلسے کی صدارت کی۔ وقار خلیل صاحب ایڈیٹر "سب رس" نے "سوانح اور تذکرے" کے زیرِ عنوان ایک پُرمغز مضمون سنایا جو پسند کیا گیا۔ (فیض الحسن خیال معتمد)

## بزمِ ادب مئو

۱۵ جولائی ۶۲ء کو بزمِ ادب مئو کی پندرہ روزہ نشست زیرِ صدارت حضرت فضا ابن فیضی منعقد ہوئی۔ صاحبِ صدر نے بزمِ ادب کے مجلہ میگزین کی اشاعت سے متعلق خط و کتابت کی تفصیل سنائی۔ آپ نے بتلایا کہ بیشتر حضرات کی تخلیقات موصول ہو چکی ہیں۔ امید ہے کہ میگزین ستمبر کے اوائل میں منظرِ عام پر آ جائے گا۔ اس کے بعد موصوف نے بزمِ ادب کے شعرا و افسانہ نگار حضرات سے اپنی تازہ تخلیقات پیش کرنے کی فرمائش کی۔ نشست کی کارروائی رات کے تقریباً بارہ بجے اختتام پذیر ہوئی۔ (سردار شفیق)

## بزمِ غالب (میسور)

بزمِ غالب کا بارہواں سالانہ اجلاس اور ایک طرحی مشاعرہ، مولوی مظہر الصمد صاحب شاہد میسوری۔ ایم۔ اے (علیگ) کی صدارت میں ۱۴ جولائی ۱۹۶۲ء کو منعقد ہوا جس میں شہر میسور کے فاضل مقررین نے غالب کی زندگی اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی اور شعرائے کرام نے اپنی غزلوں سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

(تپش میسوری
معتمد بزمِ غالب۔ میسور)

## سماجی کام کی انسائیکلوپیڈیا

نئی دہلی کی ایک اطلاع کے مطابق ہندوستان میں سماجی کام کی ایک انسائیکلوپیڈیا کی تالیف کی جا رہی ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ سماجی کام کے سلسلے میں تمام مکمل پالیسیوں، پروگرام اور رجحانات کو تاریخی پس منظر کے ساتھ باضابطہ و معتبر اعداد و شمار کے ساتھ پیش کیا جائے۔

اس کی تیاری منصوبہ بندی کمیشن کی ایما پر مرکزی سماجی بہبود بورڈ کی طرف سے کی جا رہی ہے۔

## انجمن تعمیرِ اُردو دلّی

۱۵ جولائی کو اردو ہال میں انجمن تعمیرِ اُردو دہلی کی طرف سے شری برجموہن صاحب صدر دلّی صوبہ کانگریس کمیٹی اور نورالدین صاحب میئر دلّی کارپوریشن کی خدمت میں سپاس نامے پیش کئے گئے۔ دونوں حضرات کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، انجمن تعمیرِ اُردو کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ دلّی میں اُردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی کوشش کریں۔ اسی سلسلے میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ سابق دلّی اسمبلی کے متفقہ لسانی فیصلے کو کلی طور پر جلد نافذ کیا جائے۔ کارپوریشن میں اُردو کو وہی درجہ دیا جائے جو اسے دلّی اسمبلی میں حاصل تھا۔ دلّی ایڈمنسٹریشن اور کارپوریشن اُردو کو دلّی کی دوسری سرکاری زبان تسلیم کرے اور کارپوریشن کے اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔

شری برجموہن نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ دلّی میں اُردو کو اس کا صحیح مقام اور جائز حقوق حاصل نہیں ہیں۔ ہرچند کہ کارپوریشن نے ہندی کے بعد اُردو کو دوسری زبان تسلیم کرتا ہے۔ لیکن صرف اسی سے اُردو والوں میں بھروسہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اُردو کی تعلیم کا مناسب انتظام بھی کیا جائے۔ انھوں نے اس مسئلے کی طرف فوری توجہ دینے کا وعدہ کیا۔

نورالدین صاحب میئر کارپوریشن نے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ دلّی کی اُردو اور ہندی دونوں میری زبانیں ہیں۔ مجھے اُردو کے نام پر اصرار نہیں ہے۔ مگر وہ زبان مجھے یقیناً پیاری ہے جو دلّی میں بولی جاتی ہے۔ اسی زبان کو گاندھی جی ہندوستانی کہتے تھے۔ اور یہی زبان بنگال سے لے کر سندھ تک اور کشمیر سے لے کر راس کماری تک پھیلی ہے۔

اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے نورالدین صاحب نے فرمایا کہ اُردو کو مشکل بنانے کی جو روش حیدرآباد نے اختیار کی تھی، اسی مہلک راہ پر آج ہندی گامزن ہے۔ ملک کا اتحاد انگریزی اور ملی جلی آسان ہندوستانی کے رواج پر منحصر ہے۔

تحسین انصاری

# مقصدِ حیات

(اپنے طلبہ کے نام)

یہ زندگی کی اُداس راہیں
نہ آنچلوں کی حسین چھاؤں، نہ گیسوؤں کے لطیف سائے
نہ مسکراتی شریر آنکھیں، نہ گنگناتی حسین بہاریں
نہ پھر ہی کوئی اشارہ، نہ زندگی کو کوئی سہارا
اداس پہ یہ تلخ و ترش ماحول جس میں خود کو سنبھالنا ہے
کہ جس طرف بھی نظر اٹھے زرد زرد چہروں کا سامنا ہے
یہی نہیں بلکہ ہر قدم پر گرہ میں ایک پیچ باندھنا ہے
مرے ندیم! ایسے تلخ ماحول میں بھلا کوئی صاحبِ دل
کہاں تلک زندگی کے شعلے کو اپنے دل میں دبائے رکھے
کہاں تلک موت کے فسوں سے نظر کا دامن بچائے رکھے
مگر یہ بچے!*

یہ میرے بچے، جو دور سے مجھ کو دیکھتے ہیں
بڑی محبت سے پیار سے بڑھ کے میرے ہاتھوں کو تھامتے ہیں
مری شکستہ حیات کو اپنے بازوؤں پر سنبھالتے ہیں
مری فسردہ نظر پہ اگلی بہار کا عکس ڈالتے ہیں
میں ان کی چاہت کا آسرا لے کے حوصلوں کو پکارتا ہوں
مٹی ہوئی آرزو کے غنچوں کو از سرِ نو نکھارتا ہوں
نئے عزائم سے پھر تمنائے زندگی کو سنوارتا ہوں

کہ! میری ہستی جو ان کے کام آئے یہ بھی میرے لئے بہت ہے
مرا لہو، ان کا خون گرمائے یہ بھی میرے لئے بہت ہے

عادل منصوری

## "دوڑ"

ایک صحرائے خیال
دور تک پھیلا ہوا
غم کی تپتی دھوپ میں جلتا ہوا
اپنا منہ پھاڑے ہوئے میرے لئے

آرزوؤں کے سراب
چار سو پھیلے ہوئے
ایک بحرِ بیکراں کے روپ میں
دے رہے ہیں پیاسی نظروں کو فریب

جلتے صحرا میں یونہی
میں تھکن سے چور پیاسا جاں بلب
دوڑتا ہوں آرزوؤں کے سرابوں کی طرف
اور نہ جانے دوڑ یہ جاری رہے گی کب تلک؟

سوچتا رہتا ہوں میں
دوڑتا رہتا ہوں میں

# غزل

حسین علی افسر

بے التفاتیوں میں جو پنہاں تھا التفات — آساں ہو گئی مجھے پر مشکلِ حیات
جلوے ترے سمٹ گئے سب اپنی نگاہ کے — کعبہ کا نور ہو کہ تجلیِ سومنات
کل کائنات میری نظر میں حسین ہے — وہ کام کر گیا ترا اک حسنِ التفات
افسر شرابِ عشق سے دھوتے رہے ہیں ہم
نکھرا ہے جا کے جب کہیں اپنا رُخِ حیات

کیف احمد صدیقی

شیشۂ دل پر حوادث کا اثر ہوتا نہیں
اور ذرا سی ٹھیس لگ جائے تو چکنا چور ہے
جانے کس منزل پہ تیرا عشق لے آیا مجھے
آنکھ میں آنسو ہیں لیکن دل بہت مسرور ہے
مجھ سے تم یہ پوچھو نہ، کیا ہے میرے دل کا مدعا
بس وہی میں چاہتا ہوں جو تجھے منظور ہے

صلاح الدین نیّر

بساطِ گل ہو یا دامانِ صحرا — جنوں کا قافلہ چلتا رہے گا
دیارِ دل میں آپ آئیں نہ آئیں — چراغِ آرزو جلتا رہے گا
نشاطِ غم بھی گر تم چھین لو گے
ہماری زندگی میں کیا رہے گا

نزوار حسین احمر

ہم دہر کو فردوس بنانے پہ مُصر ہیں — دنیا طلبی منزلِ مقصود نہیں ہے
ہمدم مجھے پروائے خلیل نہیں لیکن — سینے میں نہاں آتشِ نمرود نہیں ہے
کیا صرفِ گلستاں نہیں خونِ دلِ احمر
کیا صبحِ بہاراں شفق آلود نہیں ہے

شہاب اچھنی

تمام عمر نہ اک فرصتِ گناہ ملی — بہت سنا تھا ترے لطف کے فسانے کو
نہ جانے کیسی ہوا چل رہی ہے گلشن میں — ترس رہا ہے ہر اک غنچہ مسکرانے کو
مری تباہیِ دل دیکھتی ہے حسرت سے
کبھی تمہاری نظر کو کبھی زمانے کو

* میرے بچوں سے مراد وہ طلبہ ہیں جو کہ اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں اور مجھ سے تعلیم پاتے ہیں۔

مراسلات

## ساہتیہ اکیڈیمی راجستھان کی اُردو دشمنی

ساہتیہ اکیڈیمی راجستھان شہر اودے پور میں جنوری ۱۹۵۸ء سے ہندی، اردو، راجستھانی اور سنسکرت زبانوں کی حفاظت، ترویج اور ترقی کی غرض سے قائم ہے اور مبلغ ۱½ لاکھ روپیہ سالانہ اس کو گورنمنٹ راجستھان کے خزانہ سے اسی لئے ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خزانہ کو راجستھان کے لوگوں سے وصول کردہ ٹیکس پُر کرتے ہیں۔ جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ مگر اس ساڑھے چار سال کی مدت میں اس ادارے نے اُردو پر ایک پائی بھی خرچ نہیں کی۔ بلکہ اُردو کا حق غصب کرکے دوسروں کو بخشا ہے۔ چنانچہ اس وقت اس ادارے کی سالانہ رپورٹ بابت سنہ ۶۱ء۱۹۶۰ء پیش نظر ہے جس سے ظاہر ہے کہ شری جنار دھن رائے ناگر پریزیڈنٹ اور شری موتی لال مناریا ڈائرکٹر ادارہ مذکور نے بڑی فراخ دلی سے ہندی اور راجستھانی پر اخراجات کئے ہیں یا سنسکرت کو نوازا ہے مگر اُردو کو قطعاً نظر انداز کرکے آج تک نہ اس کا ایک حرف چھاپا نہ اس کے کسی ادارے یا ادیب کی کوئی مدد کی نہ اس کا کوئی نام و نشان تک کہیں آنے دیا۔ مثلاً رپورٹ مذکور سے ظاہر ہے کہ دو دو ہزار روپیہ تک کے چار انعام۔ تین تین سو تک کے سات مستقل وظیفے۔ اور تین تین سو روپیہ تک کے پانچ غیر مستقل وظائف۔ ڈھائی ڈھائی ہزار تک کے نو عطیات مصنفین و مولفین کو۔ ڈھائی ڈھائی ہزار تک کی سات رقمیں صحیفہ نگاروں کو۔ ڈھائی ڈھائی ہزار تک کی امداد مختلف سنستھاؤں کو اور بارہ بارہ سو روپے تک مختلف تقریبات کے لئے بارہا عطا کئے۔ مگر اُردو پر ایک پیسہ خرچ نہیں کیا۔ ان دونوں صاحبان کی اُردو دشمنی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ وہ کوئی تحریر تک اُردو میں لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور نہ کوئی اُردو کا کلرک تک ملازم ہے نہ ممبروں میں اُردو کا کوئی مسلم الثبوت مصنف و ادیب شامل کیا گیا اس لئے کہ ہر دو افسران مذکور اُردو سے قطعاً بے بہرہ ہیں اور ان کا دماغ اُردو کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ ان صاحبان نے اُردو کُشی کی ایک منظم اسکیم کو اپنا لیا ہے۔ اور من مانی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں ذرا تامل نہیں ہے۔

اس لئے گورنمنٹ راجستھان سے استدعا ہے کہ وہ اس ادارے کے معاملات کو بنظر تحقیق دیکھے اور مداخلت کرے یعنی

(الف) پریزیڈنٹ اور ڈائرکٹر ایسے اصحاب کو مقرر کرے جو چاروں زبانوں سے بخوبی واقف ہوں اور صاف دماغ و بے تعصب ذہنیت کے مالک ہوں۔

(ب) کم از کم ۱½ ممبر اس ادارے میں ایسے شامل کئے جائیں جو مسلم الثبوت ادیب اور متعدد تصانیف شائع کرچکے ہوں۔ صرف دقیانوسی ٹکٹ بندنہ ہوں۔

(ج) ہر دو صاحبان مذکور کی کارروائیوں کی جانچ کی جائے اور ثابت ہونے پر کہ انھوں نے اُردو کا حق غصب کیا ہے، جس کے ثابت ہونے کی پوری امید ہے ان کی نسبت تدارک کیا جائے۔

(د) آئندہ کے لئے مضبوط انتظام کیا جائے کہ اُردو کا حق غصب نہ ہو۔ اور چاروں زبانوں کا بلحاظ رقم کوٹا مقرر کردیا جائے۔

واضح رہے کہ جن لوگوں پر ان افسروں نے عنایتیں کی ہیں ان میں ایک نام قاضی معراج دھولپوری صاحب کا بھی ملتا ہے۔ جن کو اُردو کے ادیب کی حیثیت سے وظیفہ دینے کا خیال کرنا غلط ہوگا۔ وہ ہندی کے بھی ادیب ہیں، اسی لئے ان کو نوازا جاکر ایک ناکام پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

(سید امتیاز علی ایم۔ اے۔ از اجمیر)

## ناول اور ناولٹ

الفاظ "ناول" اور "ناولٹ" مذکر ہیں یا مونث؟ یہ دونوں انگریزی کے الفاظ ہیں۔ ان کے مترادفات کہانی، داستان، قصہ، حکایت وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن کہانی، داستان اور حکایت مونث ہیں اسی لئے بعض مصنفین "ناول" اور "ناولٹ" کے الفاظ بھی مونث لکھتے ہیں۔ لفظ قصہ مذکر ہے اسی لئے بعض لوگ 'ناول' اور 'ناولٹ' کو مذکر لکھتے ہیں۔ مختتم طور پر اگر اس کا فیصلہ ہوجائے تو آئندہ مضمون نگاروں اور مصنفوں کو اس باب میں آسانی ہوگی۔ (ایک خریدار)

ہماری رائے میں ناول کو مذکر اور ناولٹ کو مونث لکھنا چاہئے۔ —— (ادارہ)

امتیاز علی عرشی

# غالب کے ثقل سماعت کی تاریخ

مخدومی پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کا ایک مراسلہ مندرجہ بالا عنوان کے تحت ہماری زبان مورخہ یکم جولائی میں شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے غالب کے ثقل سماعت کی تاریخ بیان کی ہے۔ میں نے مکاتیب غالب (ص ۱۹۵، طبع چہارم ۱۹۴۹ء) میں اس پر کچھ مسالہ اکٹھا کیا تھا جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔
(عرشی)

آل محمد مارہروی نے دیوان تواریخ ۲۴۰/۲۴ میں ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "تاریخ کر شدن مرزا اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب المشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی" خود قطعہ یہ ہے:

کان بہرے ہیں مرزا نوشہ کے آہ — بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے
دوستو تاریخ اسکی عجیب ہے — یوں کہی مریخ کہ غالب کر ہوئے"

اس مادۂ تاریخ سے اعداد ۱۲۷۲ نکلتے ہیں جو سال ہجری ہے اور ۲۲ اگست ۱۸۵۵ء تا ۱۰ اگست ۱۸۵۶ء سے مطابق رکھتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آئندہ عرض کروں گا، یہ تاریخ ایک غلط فہمی کی بنا پر نکالی گئی ہے۔ دراصل مرزا صاحب اس سے برسوں پہلے بہرے ہو چکے تھے، چنانچہ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو تفتہ کے نام کے خط میں لکھتے ہیں: "بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرہ ہو گیا ہوں" (اردوی: ۱۱۳) ایک شنبہ ۱۹ دسمبر سنہ بالا کو منشی نبی بخش کے خط میں، جن کی بینائی میں ضعف آگیا تھا، لکھتے ہیں کہ: "کاروان ما را ہمیں شنیدن و دیدن و گفتن و رفتن متاع است، چرا بتاراج نرود۔ یکی را گوش گرانست، تا ہمنشیں چہ سراید؟ یکی را چشم نگرانست تا کہ می آید" (باغ دودر، ۱۶۰ الف) یہ بہرے ہونے کی تاریخ سے متعلق ان کے قطعی اور تصریحی بیانات ہیں لیکن ہم اس تاریخ کو اور پیچھے لے جا سکتے ہیں۔ ایک فارسی خط میں شفق کو تحریر کیا ہے: "اکنوں کہ دنداں فرو ریخت، و گوش گراں گشت، و موئے سپید ست و روی چو آذرنگ، دست بلرزہ اندر است، و پائے در رکاب" (پنج آہنگ: ۴۹۰ طبع دوم) اس خط میں جواں بخت کے سہرے کا قضیہ دہرایا ہے، مرزا صاحب کا سہرا، ذوق کا جواب اور مرزا صاحب کی معذرت یہ سب دہلی اردو اخبار، مورخہ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۸ھ ([illegible] ۱۸۵۲ء) میں شائع ہوئے تھے۔ غالباً اس اخبار کو پڑھ کر شفق نے استفسار حال کیا، اور یہ سب کچھ اس واقعہ کے فوراً بعد پیش آیا، اس لیے کہ مرزا صاحب نے بیان واقعہ سے پہلے لکھا ہے: "تا دیدہ وراں از دور بنگرند کہ نامہ نگار را مژہ خوں فشانست و دل دردمند" ظاہر ہے کہ دل کی دردمندی اور مژہ کی خوں فشانی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی اور کچھ ہو بھی، تو اتنی تو یقیناً نہ ہوگی کہ اُسے ایسے پُر درد انداز سے بیان کیا جائے۔ لہٰذا مرزا صاحب کو ۱۸۵۲ء کے آخر کی بجائے اب آغاز میں بہرہ ہونا چاہیے۔

سرور کے خط میں فرماتے ہیں: "ہیں ہاں سات برس سے بہرہ ہو گیا ہوں" (عود [illegible]) یہ خط اُن کے نام کے خطوں میں دوسرا ہے، اور تیسرا خط پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا تھا، اس بنا پر اسے بھی ۱۸۵۸ء ہی کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ صحیح ہے، تو پھر مرزا صاحب کے اس تخمینے کے پیش نظر انھیں ۱۸۵۱ء میں بھی ثقل سماعت کا مریض ہونا چاہیے۔

مرزا صاحب ایک فارسی قصیدے میں، جو واجد علی شاہ کی مدح میں ہے اور کلیات (ص ۳۲۱) میں چھپ چکا ہے، فرماتے ہیں:

فغاں ز بہری و رنجوری و گرانی گوش
کہ کرد ایں ہمہ دشوار کار آساں را

یہ قصیدہ واجد علی شاہ کے مدحیہ قصیدوں میں دوسرا ہے۔ تیسرا قصیدہ لکھنؤ کی کربلائے معلی میں تزک و احتشام کے ساتھ ضریح لے جانے سے متعلق ہے۔ ضریح کا واقعہ تاریخ اودھ (۴/۱۰۰) کے مطابق پنجشنبہ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ھ (۲۵ مئی ۱۸۵۴ء) کو پیش آیا تھا، لہٰذا مرزا صاحب نے قصیدہ سنہ ۱۸۵۴ء ہی میں لکھا ہوگا۔ پہلے قصیدے کی تاریخ ابھی تک متعین نہیں ہو سکی ہے، دوسرا قصیدہ میری رائے میں ۱۸۴۹ء کے آخر میں لکھا گیا ہے، اس لیے کہ اس میں مرزا صاحب فرماتے ہیں:

کہ گفتہ است در آئین بزم سور و سرود — کہ فرخی بود روز ہائے آباں را
من از درازی شبہائے قوس بیزارم — کہ بہر انجمن آرد خلل مستاں را
خوشا درازی شب زانکہ گر بود تاریک — ز رنگ منظر افروز بود چراغاں را
و گر بود شب مہ تیز بزم عیش آرای — بجز صفای تجلی ز ماہ تاباں را

ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ لکھتے وقت ماہ آباں کی راتیں تھیں، اور آفتاب برج قوس میں براجمان تھا۔ آبان ایرانی سال کا آٹھواں مہینہ ہے اور انگریزی مہینوں میں سے نومبر کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ پنج آہنگ (ص ۲۱۲، طبع ثانی) میں مرزا صاحب کا ایک خط مرزا حیدر کے نام ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ "در سر آغاز سال گریختہ در مدح ... سلطان عالم (واجد علی شاہ) قصیدہ انشا کردم۔ عرضداشتی در نثر نیز رقم زدم و آں قصیدہ و عرضداشت بہ قطب الدولہ فرستادم۔ قطب الدولہ مروی کردہ قصیدہ و عرضداشت بنظر جہانبان دارا دربان درآورد ..... پسندیدۂ طبع بلند شہریار افتاد و بہ قطب الدولہ فرمان رفت کہ بیگم دگر عرضداشت را دوبارہ بنظر گزرانند ..... ناگاہ انجمن برہم خورد و کار قطب الدولہ از کار افتاد و بیچارہ آں قصیدہ و آں عرضداشت را ہم چناں بسوی من برگرداند" اس کے بعد مرزا حیدر سے درخواست کی ہے کہ آپ اس قصیدے اور عرضداشت کو پیش کر کے صلہ دلائیے۔

قطب الدولہ کے اخراج کا واقعہ تاریخ اودھ (ج ۲ ص ۱۸۵) کے مطابق یکشنبہ ۱۷ رجب ۱۲۶۶ ہجری (۲۸ مئی ۱۸۵۰ء) کو پیش آیا تھا، میرے نزدیک یہی قصیدہ دوم تھا جو قطب الدولہ کی معرفت پیش ہوا تھا، اس لئے کہ میرزا صاحب نے آغاز سال گذشتہ میں اس کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جو قصیدہ جنوری میں بھیجا جائے گا، وہ نومبر اور دسمبر ہی میں لکھا جانا چاہیئے۔

ان دلائل کے ثابت ہو جانے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا صاحب اس کے لکھتے وقت بہرے تھے، اور چونکہ وہ نومبر سنہ ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا ہے، لہٰذا آخر سنہ مذکور میں اُنھیں اس مرض میں مبتلا ہونا چاہیئے۔

میرزا صاحب نے ایک فارسی قصیدہ آئندہ کی مدح میں لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

نالم از درد دل، اما چارہ جلد خواہم زکس
من کہ نتوانم بگوش من رسد آوای من

اس شعر میں اپنے ضعف کا بمبالغہ بیان مقصود ہے، یعنی میرا حال کمزوری سے یہ ہو گیا ہے کہ منہ سے آواز نہیں نکلتی، یا نکلتی ہے تو بے حد پست، حتیٰ کہ میں خود اسے نہیں سُن سکتا، پھر ایسی حالت میں کسی سے کیا اعانت کی امید کروں، وہ میری کب سُن سکے گا۔ جو مد کو آگے بڑھے مگر میرا خیال ہے کہ میرزا صاحب نے یہ مضمون اپنے بہرے پن کی حالت سے پیدا کیا ہو، تو کچھ بعید نہیں، اگر یہ خدشہ درست ہے، تو انھیں ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) سے قبل سے بہرہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ یہ قصیدہ سن مذکور کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہونے کے باعث اُس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

نتیجۂ بحث یہ ہے کہ میرزا صاحب ۱۸۵۲ء میں بالیقین بہرے تھے، سنہ ۱۸۴۹ء میں گمان غالب ہے کہ بہرے ہوں اور سنہ ۱۸۴۵ء میں ان کے بہرے ہونے کا احتمال ہے۔

آل محمد مارہروی کو یوں غلط فہمی ہوئی کہ میرزا صاحب نے سرور کے ۱۸ نومبر ۱۸۵۵ء کے خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کرکے لکھا تھا کہ "اگرچہ ۶۳ برس کی عمر میں بہرہ ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں" (عود: ۱۲) اس سے میرزا صاحب کا مقصد صرف یہ تھا کہ گو بہرہ ہوں، مگر اس بڑھاپے میں بھی نگاہ تیز ہے، آل محمد صاحب یہ سمجھے کہ ۶۳ برس کی عمر میں بہرا پن شروع ہوا۔

(مکاتیب غالب طبع چہارم ص ۱۵۹ تا ص ۱۶۱)

[illegible]

## ہماری ڈاک

ہماری زبان کا ایک ایک لفظ مطالعہ کے لائق ہوتا ہے۔ ان دو شماروں میں کئی معلوماتی مضامین پڑھنے کو ملے۔ (فن ترجمہ، اُردو املا اور اُردو کی ابتدا) فن ترجمہ میں مضمون نگار نے جو اصول ترجمہ کے لئے بتائے ہیں، دراصل وہی اچھے ترجمہ کے لئے درکار ہوتے ہیں۔

اردو املا کے متعلق ایک سوال بہت دنوں سے میرے دماغ میں اُٹھ رہا ہے کہ ہمارے اُردو املا کے لئے نئی نئی علامتوں کی تشکیل سے کیا اُردو املا اور بھی مشکل نہیں ہو جائے گا۔ یہ عمل دیگر زبانوں کے لفظوں کو اپنانے میں اور ان کو ان کے اصلی تلفظ کے ساتھ لکھنے میں بلاشبہ مدد دے سکتا ہے۔ لیکن یہ زبانوں کی ارتقا کے اصول کے خلاف ہوگا۔ (میری ناقص رائے میں) اُردو کے متعلق جو عام شکایت ہے تو یہی ہے کہ اس کا املا بہت مشکل ہے۔ اس لئے ہم کو آسان بنانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

اس کے علاوہ ہم یہ بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ اب تک اُردو زبان میں دیگر زبانوں کے جتنے بھی الفاظ آئے ہیں انھیں اُردو کے حروف تہجی نے اور اس کی علامتوں نے اپنے چلن و لہجہ اور روز مرہ کے کھاؤ روپ کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ یہی عمل آئندہ بھی جاری رہ سکتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اُردو کے لئے دوسری زبانوں کے سود مند لفظوں کو اس کی توسیع کے مقصد کے لئے ارادی طور پر بھی ڈھالنا پڑے گا۔ ایسا کرنے پر نہ اُردو املا مشکل ہوگا اور نہ اُردو کی انفرادی حیثیت پر کوئی آنچ آئے گی اور دوسری زبانوں سے قریب تر بھی ہو جائے گی۔ لہٰذا میری ناقص رائے میں اُردو کے املا میں تبدیلیاں صرف دیگر زبانوں کے لفظوں کو اپنانے کے لئے سود مند ثابت نہ ہوں گی۔

(اشفاق احمد اعظمی)

# شعرا قومی اتحاد کو مضبوط کرنے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں

## ہندستانی ادبی جلسے میں ڈاکٹر گوپال ریڈی کی تقریر

ڈاکٹر بی گوپال ریڈی مرکزی وزیر نشر و اشاعت نے ہندستانی ادبی سوسائٹی کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جذباتی ہم آہنگی اور قومی اتحاد اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک لوگ بغیر کسی حقارت کے ہر زبان کی عزت نہ کریں گے۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کسی ملک میں متعدد زبانیں اور مذاہب ہونے سے ثقافتی یکجہتی کو تقویت پہنچتی ہے۔ تمام زبانیں اور مذاہب کنول کے پھول کی پنکھڑیوں کے مانند ہیں۔

ڈاکٹر ریڈی نے کہا کہ سیاست والوں کے مقابلے میں شعراء اتحاد کو مضبوط کرنے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سیاست داں آتے جاتے رہتے ہیں ان کا عروج و زوال ہوتا رہتا ہے لیکن شاعر اپنے کلام کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اس لئے شاعر محبت اور اتحاد کا پیغام بہتر طریقے سے بو سکتے ہیں۔

ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ قومی اتحاد پیدا کرنے کے لئے سوسائٹی کی کوشش کا خیر مقدم کرتے ہوئے ڈاکٹر ریڈی نے امید ظاہر کی کہ دوسری انجمنیں بھی اس مثال کو اپنائیں گی۔

# ریڈیو کی ہندی

## وزیر نشر و اطلاعات مسٹر گوپال ریڈی کی وضاحت

مرکزی وزیر برائے نشر و اطلاعات مسٹر گوپال ریڈی نے چنڈی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ریڈیو پر نشر کی جانے والی ہندی دہلی میں بولی جانے والی ہندی کی زبان سے زیادہ قریب ہو جائے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ دہلی کے عام لوگ جیسی ہندی بولتے ہیں ویسی ہی ہندی ریڈیو پر نشر کی جائے۔ اب تک جو ہندی ریڈیو سے نشر ہوتی رہی ہے وہ ہندی بولنے والوں کے لئے تھی۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ بنگال اور مدراس کے غیر ہندی علاقہ کے لوگ بھی ہندی سیکھ سکیں۔

مسٹر ریڈی نے کہا کہ یہ غلط ہے کہ وہ ریڈیو کی ہندی اُردو میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کی کوشش یہ ہے کہ ملک کے تمام حصوں کے لوگ ہندی سیکھ سکیں اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ریڈیو پر نشر کی جانے والی ہندی وہ ہندی ہو جو دہلی میں بولی جاتی ہے۔

# پنشن یافتہ اساتذہ کے لئے اعزازی رقوم

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایک اسکیم تیار کی ہے جس کے ذریعہ منتخب اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں کو ان کی پنشن کے بعد ۴ ہزار روپیہ بطور اعزازی رقم کے اور ایک ہزار روپیہ سالانہ بطور اخراجات کے دو سال تک دیا جائے گا۔ اس سال حسب ذیل اشخاص منتخب کئے گئے ہیں:-

ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ اسحاق اور ڈاکٹر ہادی حسن (عربی اور فارسی) مسٹر عبدالقادر سروری (اُردو) پروفیسر حبیب الرحمٰن (تعلیم) مسٹر ایس۔ سی دیپ اور پادری جے۔ آر۔ سیکفیل (انگریزی) ڈاکٹر منشی رام شرما (ہندی) ڈاکٹر ایم۔ ایل۔ شرما۔ ڈاکٹر بی ایس۔ کرشنا سوامی آئنگر اور ڈاکٹر جے۔ این بنرجی (تاریخ) مسٹر کے۔ کے بھٹا چاریہ (قانون) ڈاکٹر بی۔ این۔ اے (فلاسفی) مسٹر آر۔ پی۔ کانگلے اور مسٹر سادھو رام (سنسکرت) ڈاکٹر وی اے۔ سُندرم عثمن اور ڈاکٹر ایم۔ بی۔ کپاڑی (کیمسٹری) ڈاکٹر ڈی۔ کے۔ چکرورتی (جیالوجی) ڈاکٹر بی۔ بی سین اور مسٹر ڈی آر۔ کیپریکر (میتھیمٹکس) مسٹر کے۔ این بابو (علم ادویات) اور ڈاکٹر اے۔ سی۔ سین (علم حیوانات)۔

# ہندی کو رومن رسم خط اختیار کرلینا چاہئے

## کیرالا کے گورنر وی وی گری کا مشورہ

کوٹایم ۱۵ر جولائی۔ کیرالا کے گورنر اور کیرالا یونیورسٹی کے چانسلر مسٹر وی وی گری نے کہا کہ ہندی کو رومن رسم الخط اختیار کرلینا چاہئے۔

کیرالا یونیورسٹی کی طرف سے قائم کئے گئے سی ایم ایس کالج میں انگریزی پڑھانے کے ادارے کا افتتاح کرتے ہوئے ایک تقریر میں جو ان کی طرف سے پڑھی گئی تھی انھوں نے کہا کہ اس طرح صرف مختلف ریاستوں اور علاقوں کے لوگوں ہی کو ہندی سیکھنے میں آسانی نہ ہوگی بلکہ غیر ملکیوں کو بھی ہندی سیکھنے میں مدد ملے گی۔

مسٹر گری نے کہا کہ ہندی کے رومن رسم الخط اختیار کرلینے میں جذبات ضرور رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی ساری زبانیں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائیں۔ لیکن انھوں نے کہا کہ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو ایسے احساسات پس پشت ڈال دینا چاہئیں اور رومن رسم الخط کو اپنا لینا چاہئے۔

تاہم انھوں نے مزید کہا کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مسئلے کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کرلینا چاہئے۔

# کامٹی سے پندرہ روزہ "نور" کی اشاعت

کامٹی سے ایک پندرہ روزہ رسالہ "نور" ماہ اگست سے شائع ہو رہا ہے۔ زبان کسی حد تک عام فہم اور آسان ہوگی۔ اس کے ایڈیٹر جناب تبسم شفائی ہیں جو ادبی پرکاش دھرم پیٹھ ناگپور سے چھپوا کر بنا گودام کامٹی سے شائع کریں گے۔ فل اسکیپ سائز کے تقریباً دس صفحات پر مشتمل ہوگا۔

ایم حبیب خاں

# کتابوں کی درجہ بندی میں ترسیم اعداد کی اہمیت

کتب خانے کے لئے کتابوں کی درجہ بندی (classification of Books) کا کام بہت ضروری ہے مگر یہ جتنا مشکل ہے اتنا ہی ضروری بھی ہے۔ درجہ بندی کے بغیر کسی کتاب کا آسانی سے ملنا ناممکن ہے۔ اس کے بغیر ناظرین کو اپنی پسند اور ضرورت کی کتابیں نہیں مل سکتیں۔ مثال کے طور پر لائبریری میں بہت سی کتابیں ایک جگہ انبار کی شکل میں رکھی ہوئی ہیں اگر اس میں سے ہم تنقید یا تاریخ ہند کی کوئی کتاب دیکھنا چاہیں تو آسانی سے نہیں مل سکتی تاوقتیکہ اس کی درجہ بندی نہ ہوگئی ہو۔ کتابوں کی تقسیم یا درجہ بندی کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین بغیر کسی کی مدد کے آسانی سے اپنے اس مضمون کی کتابیں حاصل کر سکیں جس پر وہ کام کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں۔ کتابوں کو فن وار تقسیم کرنے سے ایک موضوع کی ساری کتابیں ایک جگہ مل جاتی ہیں۔ اس طرح کتابوں کی تلاش میں دقت نہیں ہوتی۔

کتابوں کی درجہ بندی کرتے وقت ترسیم اعداد (Notation) کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کتابوں کی تقسیم یا درجہ بندی مضمون کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ اور جس ترتیب سے کتابوں کو درجہ بندی کے بعد ترتیب دیا جاتا ہے اسی ترتیب سے کتابوں کو حروف تہجی کے لحاظ سے الماریوں میں لگا دیا جاتا ہے۔ کتاب آسانی سے تب ہی نکل سکتی ہے جب کہ مضمون کے کچھ اعداد یا حروف مقرر ہوں۔ کتابوں پر تو مضمون لکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مضمون کی شناخت کے لئے کچھ علامتیں (Symbols) مقرر کر دئے جاتے ہیں جن کو ترسیم اعداد یا Notation کہتے ہیں۔ ان علامتوں کے ذریعہ کتاب آسانی سے مل جاتی ہے۔ مثلاً ہمیں "تاریخ ہند" پر کچھ کتابیں دیکھنی ہیں۔ اگر ہمیں تاریخ ہند کا نمبر ۹۵۴ معلوم ہوگا تو ہم بغیر کسی کی مدد کے اپنی ضرورت کی کتابیں نکال سکتے ہیں۔ ترسیم اعداد (Notation) میں حرف یا عدد دونوں استعمال ہوتے ہیں، اس کے اعداد ترتیب وار ہوتے ہیں جس کو ordinal number کہتے ہیں۔

ترسیم اعداد (Notation) دو طرح کے ہوتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ خالص ترسیم اعداد Pure Notation

۲۔ مخلوط ترسیم اعداد Mixed Notation

۱۔ خالص ترسیم اعداد Pure Notation

اس میں ایک قسم کے حرف یا عدد استعمال ہوتے ہیں جیسے ڈیسیمل کلاسیفیکیشن (Decimal classification) اور کولن کلاسیفکیشن (Colon classification) دونوں میں استعمال ہوتے ہیں جیسے D.C. (ڈیسیمل) کے تحت Mathematics کا نمبر ۵۱۰ ہے اور C.C. (کولن) کے تحت B ہے۔

۲۔ مخلوط ترسیم اعداد (Mixed Notations)

اس میں حرف اور عدد دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کا استعمال صرف C.C. (کولن) میں کیا جاتا ہے۔

کتابوں کی درجہ بندی یا تقسیم (classification) کا اصلی جزو ترسیم اعداد یعنی Notation ہے۔ اس کے بغیر کتاب اصولی اعتبار سے نامکمل یا اپنے صحیح حق کی حقدار نہیں ہو سکتی۔ اس میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں :-

۱۔ ترسیم اعداد کے حرف یا عدد جتنے زیادہ آسان (Simple) اور عام فہم ہوں گے اسی قدر ناظرین (Readers) کو اپنی حسب منشا کتابیں الماری یا شیلف سے نکالنے میں آسانی ہوگی۔ اس لئے اس میں صرف ایک عدد یا حرف ہونا چاہیے۔

۲۔ مختصر (Brief) حروف یا اعداد کی تعداد جتنی کم ہوگی اسی قدر ناظرین (Readers) کو کتابوں کے حروف یا اعداد آسانی سے ذہن نشین ہو سکتے ہیں، اور وہ آسانی سے بغیر کسی کی مدد کے الماری یا شیلف (Shelf) سے کتابیں نکال سکتے ہیں۔

۳۔ لچکدار (Flexibility) مضمون کے اعداد یا حروف میں لچک کا ہونا بھی بہت ضروری ہے تاکہ وقت ضرورت اس میں اضافہ کیا جا سکے۔

معاصر

# ایک اور ضرب شدید

زبانوں کے سلسلے میں ہمارے ملک میں ۱۲ سال سے جو ایک ہیجانی کیفیت پائی جا رہی ہے اور گذشتہ ۵ سال میں لسانی بنیادوں پر جو ضروری اور غیر ضروری تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں، سرکاری، علاقائی اور مادری زبانوں کے درمیان جس کش مکش یا نفرت پیدا ہو گئی ہے ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حالانکہ ہندوستان ہمیشہ سے مختلف زبانوں کا گہوارہ رہا ہے۔ زبانوں ہی کا نہیں بلکہ مختلف قوموں، فرقوں، مذاہب اور تہذیبوں نے اس کی زمین پر اس کے آسمان کے نیچے بے خوفی اور آزادہ روی سے سانسیں لی ہیں۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کی وہ تمام روایتیں جو یک جہتی کا بہترین نمونہ تھیں آہستہ آہستہ رخصت ہونا شروع ہو گئیں اور کوتاہ بین عاقبت نا اندیشوں نے اپنے مفاد کی خاطر ایک زبان اور ایک کلچر کی رٹ لگانا شروع کر دی۔ اس کا جو رد عمل ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ مادری اور علاقائی زبانوں نے اپنی اپنی جگہ سخت خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنے تحفظ اور اپنی ترقیوں کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ یہ کوششیں آئینی اور غیر آئینی، سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر مسلسل اور نہایت مؤثر ذریعہ پر شروع ہو گئیں۔ کشت و خون سے لے کر صوبوں کے بٹوارے تک نوبت پہنچ گئی اور آج علاقائی زبانوں کے بولنے، پڑھنے اور سمجھنے والے باہم ایک دوسرے سے شدید نفرت رکھتے ہیں۔ ایسی نفرت ایسا پاگل پن جس میں سرکاری زبان ہندی تو ہندی، سب سے اہم بین الملکی زبان انگریزی کو بھی نظر انداز کر دینے کا جذبہ انتہائی تیزی سے کام کر رہا ہے۔

گذشتہ بارہ سال میں ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ ایک طویل تاریخ ہے جسے دہرانے اور جس کے خدوخال واضح کرنے کے لئے سیکڑوں صفحات چاہئیں۔ دراصل صوبوں اور ان کی علاقائی یا مادری زبانوں کو آزادی دینے کے پس پشت ہندی زبان کے فروغ کی پالیسی تھی۔ ہندی سرکاری اور علاقائی دونوں حیثیتوں سے ملک پر چھا جانا چاہتی تھی چنانچہ لازمی زبان کی حیثیت سے اسے اسکولوں میں رکھا گیا اور اس کے ساتھ چند سال تک انگریزی کو بھی لازمی زبان قرار دے کر مزید کسی ایک علاقائی زبان کو لے لینے کی سفارش کی گئی جن زبانوں کو علاقائی حیثیت نہ ملی اور جو مادری زبان تک محدود رہیں، ان کی حیثیت اختیاری زبان کی ہو گئی۔ اس اندیشہ کے تحت کہ انگریزی اور ہندی کے علاوہ اگر علاقائی زبان نہ سیکھی گئی تو ملازمتوں میں سخت دشواری ہو گی، لوگ اپنی مادری زبان چھوڑ بیٹھے۔ پھر کہیں کہیں انگریزی زبان پر بھی کلہاڑا چلا اور اس کی تعلیم آٹھویں جماعت سے شروع کی جانے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ کالجوں میں جا کر طلبہ کو سخت دشواریاں پیش آئیں اور معیار تعلیم پست تر ہوتا چلا گیا۔ سب سے زیادہ اس کلہاڑے کی ضرب اردو زبان پر پڑی۔ سب سے پہلے حکومت یو پی نے ۱۹۴۹ء میں ایک ایسی نئی تعلیمی اسکیم بنائی کہ اردو زبان اختیاری مضامین میں آ گئی۔ پھر نئے صوبوں اور دو ضلعوں کے بنا دینے سے اردو کی علاقائی حیثیت بھی منتشر ہو کر رہ گئی۔ تعلیم کے علاوہ دفتری کاموں میں بھی انگریزی اور ہندی ہی کو ترجیح دی گئی۔

ریاستوں نے اپنی علاقائی زبان میں کام لینا شروع کر دیا۔ اردو غریب کہیں کی نہ رہی۔

اب بعض ریاستوں اور بعض یونیورسٹیوں میں یہ گل کھل رہا ہے کہ جو کچھ ہو وہ علاقائی یا سرکاری زبان میں ہو۔ چنانچہ راجکی یونیورسٹی نے امتحانات کے جوابات کے لئے ہندی زبان کو لازمی قرار دے دیا، جبکہ اس علاقہ میں پانچ فی صدی سے زیادہ لوگوں کی زبان ہندی نہ ہو گی اسی طرح گجرات کے ایک کالج کی درخواست نامنظور کر دی گئی جو انگریزی زبان میں تعلیم دینا چاہتا تھا۔ یہ کہا گیا کہ ریاستی قوانین کی رو سے تعلیم ہندی یا گجراتی زبان میں دی جانی چاہیئے۔

زبانوں کی اس رسہ کشی کو ختم کرنے کے بجائے "سہ لسانی فارمولا" بھی چندروں سے لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے جس سے علاقائی زبانوں اور خصوصیت کے ساتھ "اردو زبان" کو سخت نقصان پہنچے گا۔ تین زبانوں کے فارمولے میں ہندی کے علاوہ ایک جدید یورپی زبان اور ایک جدید ہندوستانی زبان کی قید رکھی گئی ہے گویا مادری یا علاقائی زبان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ہٹ دھرمی یہ کہ سنسکرت کو جدید ہندوستانی زبان مان کر اس کی تعلیم کے انتظامات شروع کئے گئے ہیں۔ حالانکہ سنسکرت نہ کسی کی مادری زبان ہے اور نہ اسے علاقائی حیثیت حاصل ہے۔

تازہ اطلاعات یہ ہیں کہ یو پی میں جنوبی ہند کی زبانوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ بظاہر یہ بات قومی یک جہتی پیدا کرنے والی بتائی جاتی ہے، لیکن دراصل یہ ایک طرح سے جنوبی ہند والوں کو خوش کرنے اور جنوبی ہند میں ہندی زبان کی مخالفت کو کم کرنے کے سلسلے کی ایک کوشش یا یوں کہنا مناسب ہو گا ایک طرح کی سیاست ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اردو جو یو پی کی عام زبان ہے اس کی تعلیم کا انتظام نہ ہونے کے برابر ہے اور جنوبی ہند کی زبانوں کو بڑھاوا دینے کے لئے ان کی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے اس کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم بھی منظور کی گئی ہے۔ یونیورسٹیوں کو بھی آمادہ کیا جا رہا ہے اور جولائی سے یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ صوبۂ یو پی کی لسانی پالیسی کی تقلید بہار، راجستھان اور مدھیہ پردیش نے پہلے ہی کی ہے اور ان ریاستوں میں بھی غالباً سہ لسانی فارمولے کے تحت جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو زبان کو نظر انداز کر کے دوسری زبانوں کو لے لیا جائے گا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ہندوستان کی بدقسمتی نے نسلوں کو زبانوں کے اس چکر میں ڈال کر تباہ کر دیا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان جو ہر علاقے کی زبان ہے، ہمارے ملک کے کئی کروڑ لوگوں کی مادری زبان ہے۔ اس زبان پر ایک اور ضرب شدید لگائی جا رہی ہے۔ اس کے تدارک کے لئے اردو والوں نے کیا سوچا ہے؟؟

(شاعر۔ بمبئی)

ضیاء احمد بدایونی

# تبصرے

## نئے

از جناب شفیق جون پوری

ملنے کا پتہ: اڈیٹر ہفتہ وار "اردو نئی دنیا" جون پور

قیمت: دو روپے

اُردو غزل نے سیکڑوں پلٹے کھائے اور اُس کے خلاف ہزاروں طوفان آئے مگر جب اُبھری تو اس شان سے اُبھری کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ حالی کے بعد اقبال اور اقبال کے بعد فانی، اصغر، حسرت اور جگر نے غزل کی نوک پلک کو جس خوش اسلوبی سے سنوارا اُس سے اس کا حُسن دوبالا ہوگیا۔ انھیں کے نام لیوا شفیق جونپوری ہیں۔ مگر اس سے یہ خیال نہ ہو کہ وہ محض مقلد ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبات کی لطافت، خیال کی طہارت اور انداز کی جدت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ غم کو پیش کرتے ہیں مگر آداب عشق کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ وہ حسن پر نظر ڈالتے ہیں لیکن تہذیب عصمت کے رکھ رکھاؤ کو لئے ہوئے۔ جذبات کی پاکیزگی کے ساتھ ان کے اشعار میں فکر کی بلندی بھی موجود ہے۔ فن کی صحت اور زبان کی پختگی اُس پر مستزاد۔ دو چار اشعار سے رنگ کلام کا اندازہ مشکل ہے۔ مگر ہماری زبان کے صفحات کی تنگ دامانی طوالت سے مانع ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

| | |
|---|---|
| مجھے بھی ناز ہے اپنی خود اعتمادی پہ | کہ آندھیوں میں نشیمن کا انتظام کیا |
| ساقی قبول ہوگئی کس رند کی دعا | وہ آرہا ہے ابر کرم جھومتا ہوا |
| کتنے سفینے ساحل مقصد سے جا ملے | ہم راہ دیکھتے ہیں کوئی ناخدا ملے |
| اللہ ری بیخودی کہ اسی آستاں پہ میں | اک اک سے پوچھتا تھا پتا کوئے یار کا |
| رہے گی میری تہذیب نظر بھی | نقاب یار کی قائم مقامی |
| معاذ اللہ کہ جس قدر نقش پیکشوں پہ ہے | اتنا تو عاصیوں سے خدا بھی خفا نہیں |

عموماً دیکھا گیا ہے کہ اچھا غزل گو اچھا نظم نگار نہیں ہوتا۔ نیز بر عکس۔ لیکن شفیق کی نظموں کا بھی ایک مقام ہے۔ انھوں نے وطنی۔ ملی۔ سیاسی موضوعات پر کافی نظمیں لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ دراصل وہ محبت کے پرستار ہیں۔ وطن کی محبت۔ گاندھی جی کی محبت۔ ٹیپو شہید کی محبت۔ حسن و عصمت کی محبت۔ غریبوں اور کمزوروں کی محبت۔ ہر نظم میں یہ لطیف جذبہ ایک ایسے انوکھے انداز میں پیش کیا ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ چند مثالیں پڑھئے اور لطف اُٹھائیے:

حُبّ وطن۔ چمن میں دے رہے ہیں دھمکیاں جو پھونک دینے کی
وہی ہوں گے نشیمن کے نگہباں، ہم نہ جائیں گے

ایضاً کانٹوں سے لاکھ پاؤں کے تلوے فگار ہوں
پھر بھی عزیز ہیں کہ زمین وطن کے ہیں

ایضاً ہماکر ساحل۔ اودھ ہے پُربہار مگر
یہ گومتی کا کنارا کہاں سے لائیں گے

درست ہے کہ ملیں گے نئے نئے احباب
وہ جون پور ہمارا کہاں سے لائیں گے

کہاں ملے گا بنارس کی صبح کا منظر
اودھ کی شام دل آرا کہاں سے لائیں گے

ہوا کہ مرکز اُردو کراچی و لاہور
شفیق سا سخن آرا کہاں سے لائیں گے

گاندھی جی۔ خود روشنی طبع بلا ہو گئی ہے تجھے
اے چاند لے کے ڈوب گئی چاندنی تجھے
جمنا میں تاب ہے کہ وہ تجھ کو ڈبو سکے
اک موج عشق تھی جو بہالے گئی تجھے
تقسیم ہو گئی ترے مسلکوں میں تیری خاک
پھرتی رہے نسیم سحر ڈھونڈھتی تجھے

ایضاً۔ فانی وہی جب کہتے تھے دشمن دین کا
آج اُسی ہند کو روتی ہے مسلمانوں کی عید

شعر نہیں اشاعر کے دل کے ٹکڑے ہیں جن کا رنگ ان نظموں میں جا بجا جھلک رہا ہے۔

غزلوں میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ ترتیب زمانی نہ سہی حروف تہجی کی ترتیب ہی ہوتی تو بہتر تھا۔ ان کے علاوہ کچھ قطعات بھی ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

## تذکرہ شعرائے قدیم نظر نگر

از حسرت سہروردی بی۔ اے۔

منیجر اسلامیہ بک ڈپو۔ کرنول (آندھرا پردیش) سے ایک روپئے میں ملتا ہے۔

بظاہر کون یقین کرے گا کہ نظر نگر (ترچناپلی) جیسے دور افتادہ مقام میں اُردو کا اس قدر چرچا ہے کہ وہاں کے شعرا کا تذکرہ تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ مگر کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ اُردو کی ہمہ گیری کا ایک اور ثبوت۔ حسرت سہروردی کی یہ کوشش قابل تعریف ہے کہ ان کی بدولت ترچناپلی کے شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام محفوظ ہوگئے۔ شروع میں جناب پروفیسر عبدالقادر سروری کا مقدمہ ہے جس میں وہ تحریر کرتے ہیں:۔ "جنوبی ہند میں اُردو زبان لاکھوں عوام کی مادری زبان ہے۔ قدیم زمانے میں شمال سے جو خاندان یہاں آئے تھے ان کی اولاد آج بھی اُردو بولتی ہے اور ان کے تعلقات کے اثر سے دوسرے لوگ بھی اُردو بول لیتے اور سمجھ لیتے ہیں۔ تلگو۔ کنڑ۔ ملیالی اور تامل کے لسانی خطوں میں بکھرے ہونے کے باوجود ان میں سے اکثروں کے گھر کی زبان آج تک محفوظ رہی۔" اس کتاب میں پندرہ شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ ہے۔ ترچناپلی کے سب سے قدیم شاعر علیم اللہ شاہ زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں۔ ان کا زمانہ اب سے تقریباً سوا سو سال پہلے کا ہے۔ اگرچہ بعض شعرا کا کلام معیاری نہ سہی، تاہم کتاب کی تاریخی افادیت میں شبہہ نہیں۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا